حضرت علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم

عصر حاضر کے سیاسی نظریئے اور اسلام

سوشلزم، جمہوریت اور دیگر نظامہائے یورپ

حضرت علامہ مرحوم کا یہ نادر مقالہ آج سے تقریباً ۲۵ برس قبل شائع ہوا تھا جس میں موجودہ دور کے سیاسی نظریوں پر اسلام کی روشنی میں بڑی محققانہ روشنی ڈالی گئی ہے۔ نظریاتی انتشار کے اس ہنگامہ پرور دور میں اس کا مطالعہ قارئین الحق کے لئے مفید ہوگا۔

(قاری سعید الرحمان راولپنڈی صدر)

★

علم کلام وہ فن ہے جس میں اصولِ دین کی حمایت کی جائے اور معترض ان پر شکوک و شبہات وارد کریں، ان کو دفع کیا جائے، لیکن کسی چیز کی حمایت و حفاظت ہر زمانہ میں ایک ہی طور سے نہیں کی جاسکتی، کیونکہ ہر زمانہ کے خیالات یکساں نہیں ہوتے۔ اس تغیر آباد عالم میں کسی چیز کو قرار نہیں، ہر وقت خیالات بدلتے رہتے ہیں، حسن و قبح کا انسانی معیار بدلتا رہتا ہے، چیزوں کی قدر و قیمت کا معیار بدلتا رہتا ہے، لیکن دین جو حق مطلق اور صداقتِ دائمی ہے، وہ ناقابلِ تغیر ہے، توحید، انبیاء، عالمِ غیب احکامِ الٰہی، آغازِ عالم سے اُن کے حقائق یکساں ہیں اور یکساں رہیں گے، اسی طرح معاملات کی صداقت اور اخلاق کی طہارت کا معیار ہمیشہ سے ایک ہے اور ایک ہی رہے گا، قتل ناحق اور دوسرے کے مال کو اس کی اجازت کے بغیر تصرّف میں لانا، جس کے انواع چوری، ڈاکہ، غصب، خیانت، رشوت وغیرہ ہیں، ہمیشہ ممنوع رہے ہیں اور رہیں گے، جھوٹ کا بُرا اور سچ کا اچھا ہونا نہ کبھی بدلا ہے، اور نہ کبھی بدلے گا۔

اوپر کی سطروں کا خلاصہ یہ ہے کہ دین ایک غیر متبدل حقیقت ہے، اور انسانی خیالات

سیلاب ہمیشہ چڑھتا اترتا رہتا ہے، ایک ہی چیز جو کبھی اعتراض کا درد تھی، دوسرے وقت میں مستحسن سمجھی جانے لگتی ہے۔ اور جو کبھی مستحسن تھی وہ دوسرے وقت میں قابل اعتراض بن جاتی ہے۔

غرض ان غیر متغیر دینی حقائق اور ان تغیر پذیر انسانی خیالات میں ایک کشاکش سی قائم رہتی ہے۔ علم کلام کا کام یہ ہے کہ اس کشاکش کو دور کرے، لیکن اس کشاکش کو دور کرنے کا طریقہ بھی یکساں نہیں رہ سکتا، کیونکہ زمانہ کے خیالات اور ہر کوشش کرنے والے کی دماغی ساخت، ذہنی فعلیت اور طریق فکر یکساں نہیں ہوتا، اس لئے زمانہ کے تغیر اور ہر صاحب فکر کے طریق فکر کے اختلاف سے اس کشاکش اور تصادم کے رفع کرنے کا طریق بھی بدلتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر زمانہ کا علم کلام دوسرے زمانہ کے علم کلام سے الگ رہا کیا ہے۔ کیونکہ حملوں کی نوعیت کے بدلنے سے ان کی مدافعت کی نوعیت بھی بدلنی ضرور ہے۔

کبھی آسمان کے خرق والتیام، جزو لایتجزیٰ، استطاعت مع الفعل وقبل الفعل، اور الواحد لا یصدر عنہ الا الواحد کے مسائل نفیاً یا اثباتاً علم کلام کے اجزاء تھے، کبھی معجزات کا صدور نبوت کے ثبوت کا معیار تھا، کبھی قرآن پاک کی فصاحت و بلاغت اسکی حقانیت کا آئینہ تھی، کبھی ان صداقتوں کے ثبوت کے دوسرے معیار پیدا ہو گئے، چنانچہ کبھی خرق عادت کی کثرت کسی دین کے ثبوت کا ذریعہ تھی اور کبھی خرق عادت کی سرے سے نفی دین کی صداقت کا معیار بنی، غرض کبھی ذہنی یونانی فلسفیانہ خیالات کی عینک سے دین کو دیکھا گیا، کبھی اشراقی صوفیانہ نظریہ کی کسوٹی پر اس کو کسا گیا، کبھی منافع دنیاوی اور شواہد عقلی کی ترازو سے ان کو تولا گیا، اور آج یورپ کے افکار و خیالات سے ان کو جانچا جا رہا ہے۔

اسی جدید عہد کے متکلمین کی کوششوں پر ایک نظر ڈالئے جو سید احمد خاں اور مفتی عبدہٗ کے زمانہ سے آج کے دن تک میدان عمل میں آئے، تو معلوم ہوگا کہ ہر دقفہ کا علم کلام دوسرے دقفہ سے الگ ہوتا رہا، سید صاحب اور مفتی عبدہٗ کا عہد وہ تھا، جب سائنس کی ترقیوں نے مادیت کا زور پیدا کیا اور فطرت اور نیچر اور قواعد طبعی اور نیچرل لازیز صداقت کا معیار بن گئے، معجزات کی نفی کی گئی یعنی ان کی تاویل کی گئی، جنت و دوزخ اور عقائد مابعد الطبعی کی باطنی تشریح کی گئی اور اسلام کا نام فطرۃ الٰہیہ ایسے معنوں میں رکھا گیا، جن معنوں میں نیچر کا لفظ بولا جاتا ہے۔

اس کے بعد وہ زمانہ آیا جب فطرت اور نیچر کی بجائے تمدن، تہذیب، طرز سلطنت اور رفاہ عام کے طور و طریق ایک دین کی صداقت اور معیاری ہونے کے دلائل ٹھہرائے گئے، یہ وہی زمانہ ہے جب الفاروق لکھی گئی، انجریہ لکھا گیا، حقوق الذمیین ترتیب پائے، اسلامی شفاخانے

اور اسلامی کتب خانے وغیرہ مضامین اشرفیوں سے تولے گئے۔

اب گذشتہ جنگ عظیم نے جب کروٹ لی، تو خیالات کی دنیا میں بھی تزلزل آیا، سیاسیات کے رنگ بدلے اور انسانی حقوق کے نئے نقشے ترتیب پائے، پھر سوشلزم کی کامیاب وحدت نے جب روس کے تخت پر قبضہ کیا، تو اقتصادیات کے نئے عقائد لوگوں میں پھیلے، اور دینی حقائق کے معیار میں بھی ایک نئی تبدیلی آگئی۔

صرف پچھلے ساٹھ ستر برس کے سیاسی تغیرات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ متکلمین اسلام نے کیا کیا پہلو بدلے، سرسید تک کی تحریروں میں شخصیت پرستی کا زور تھا، اور شخصی سلطنت ہی خیر و برکت کا موجب رہی، سید جمال الدین افغانی نے لکھا، کہ اسلام کی خیر شخصیت عادلہ میں ہے، اسی پچھلے زمانہ کے ایک بڑے عالم باعمل کی تحریروں میں شخصی بادشاہی کو عین منتہائے اسلام ہونے کی تلقین بکثرت ملتی ہیں۔

لیکن ان دماغوں نے جو ابتدائے عہد جدید میں بیدار ہوئے، دستوری حکومت کو منشائے اسلام قرار دیا، اور پھر جمہوریت کا دور آیا جس میں اسلامی حکومت کو جمہوریہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی، ابھی اسی جنگ میں جب جرمنی میں ہٹلر اور اٹلی میں مسولینی کا عروج تھا، اور بظاہر یہ نظر آتا تھا کہ فسزم اس معرکہ میں کامیاب ہو کر نکلے گا، طبائع میں یہ میلان پیدا ہو گیا، کہ حکومت اسلامیہ کو ڈکٹیٹر شپ اور فسزم کے رنگ میں پیش کیا جائے، اب فسزم اور ڈکٹیٹر شپ کی ناکامی کے بعد پھر سوشلزم کا زور ابھرنے لگا ہے، اور اب موجودہ وقت وہ ہے، جس کا علم کلام اسلام اور سوشلزم کے درمیان توفیق اور تطبیق ہے، بلکہ یہ ہے کہ سوشلزم کے مقابلہ میں اسلامی اصول سیاست و اقتصاد کی برتری ثابت کی جائے۔

تحدیث نعمت کے طور پر عرض ہے کہ آج تو اس موضوع پر لکھنے والے بہت سے اہل قلم ہیں، لیکن ہندوستان میں سب سے پہلے راقم الحروف کو اسکی توفیق ملی، غالباً ۱۹۱۰ء میں اسلام اور اشتراکیت کے عنوان سے ایک مفصل مضمون الندوہ میں سپرد قلم کیا، پھر اسی مضمون کو الہلال کلکتہ کی ادارت میں شمول کے بعد ۱۹۱۲ء میں "الحریۃ فی الاسلام" کے عنوان سے از سر نو لکھا، جو الہلال کے کئی نمبروں میں شائع ہوا، اسوقت تک اشتراکیت صرف تخیل اور نظریہ تھا، اس نے کوئی عملی صورت اختیار نہیں کی تھی، اسکی عملی صورت تو ۱۹۱۸ء سے ظاہر ہوئی، جب جنگ عظیم کے خاتمہ کے قریب روس نے بالشویک انقلاب کو کامیاب کیا۔

روسی بالشویکوں کی کامیابی نے بہت سی قوموں کے افکار میں ہیجان پیدا کر دیا، اور خصوصیت

کے ساتھ محکوم قوموں کے نوجوانوں کے دل و دماغ میں ایسی شرر انگیزی پیدا کر دی ہے کہ سوشلزم ان کا مذہب اور مارکس اور اینجل کی تصانیف ان کا دینی صحیفہ بن گیا ہے، اور ان کے اندر اسکی اشاعت اور کامیابی کے لئے وہی جدوجہد اور ایثار و قربانی کی روح پیدا کر دی ہے، جو کبھی "مذہبی مجنونوں" کا خاصہ تھا۔

سوشلزم کی تحریک اگر صرف سیاسی و اقتصادی اصلاح طلبی کی چیز ہوتی، تو مسلمانوں کو چنداں اس سے اختلاف نہ ہوتا، مگر اہل نظر جانتے ہیں کہ اس کی تہ میں لادینی دعوت کام کر رہی ہے، وہ "قیصر" اور "خدا" دونوں کو ایک ساتھ تخت اور عرش سے اتارنا اور قیصر کے محل اور خدا تعالیٰ کے معبد دونوں کو ڈھانا چاہتی ہے۔ اور بقول اقبال یہ وہ دین ہے، جس کا کلمہ لاالہ اور لاملک ہے، اور اسلام کا کلمہ لاالہ الااللہ اور لاملک الااللہ ہے، اس سے معلوم ہوگا کہ سوشلزم ایک تخریبی تحریک اور اسلام ایک تعمیری دعوت ہے۔ لیکن ایک حیثیت سے یہ مسئلہ کلام کے علمی و نظری تنگنائے سے نکل کر عملی زندگی کا معاملہ بن گیا ہے۔

سوشلزم کی تحریک اگر صرف سیاسی و اقتصادی اصلاح طلبی کی چیز ہوتی، تو مسلمانوں کو چنداں اس سے اختلاف نہ ہوتا، مگر اہل نظر جانتے ہیں کہ اس کی تہ میں لادینی دعوت کام کر رہی ہے۔ وہ "قیصر" اور "خدا" دونوں کو ایک ساتھ تخت اور عرش سے اتارنا اور قیصر کے محل اور خدا تعالیٰ کے معبد دونوں کو ڈھانا چاہتی ہے۔

یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے، مگر حقیقت ہے کہ اسلامی دعوت کی وسعت جو انسانی زندگی کے ہر گوشہ تک وسیع تھی، وہ گھٹتے گھٹتے صرف چند عقائد اور چند عبادات تک محدود ہو کر رہ گئی، بنی امیہ نے اپنے عمل سے سیاست کو دین سے خارج کر دیا، اور عباسیہ نے تہذیب و تمدن و آداب کو بھی دین کی ہمہ گیری سے الگ کر لیا، اس کے بعد ایرانی و ترکی و تاتاری سلاطین نے قرآن کے ساتھ آئین نوشیروانی اور تورۂ چنگیزی کا اضافہ کیا، وہ دین تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رکھتے تھے، مگر ان کی سیاست اور خراج و باج کے آئین قیصر و کسریٰ اور چنگیز و ہلاکو کے دستور و قواعد پر مبنی تھے، اس لئے یہ ہماری پچھلی سلطنتیں مسلمانوں کی تو ضرور تھیں، مگر اسلام کی نہ تھیں، یعنی ان کے فرمانروا مسلمان تھے، مگر ان کی حکومت کا قانون اسلامی نہ تھا، جس طرح آج انگریزی عہد میں بھی محمڈن لا جاری ہونے سے کوئی سلطنت اسلامی نہیں ہو سکتی تھی، تو کل صرف نکاح و طلاق و وقف وغیرہ قوانین کے اجراء سے سلطنت اسلامی نہیں ہو سکتی، الآیہ کہ اس کے استعمال میں ہم ایک نوع کا مجاز اور تساہل برتتے ہیں۔

یہ کہنا صحیح نہیں کہ مسلمانوں نے اس اسلامی حقیقت کی تبدیلی کو آسانی سے مان، جنگ جمل، جنگ صفین، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، حجاج کی لڑائی، معرکہ کربلا، واقعہ حرّہ، جس میں اہل مدینہ نے بنو امیہ

کے خلاف لڑائی لڑی۔ واقعہ قرامطہ جس میں علمائے عراق نے بنو امیہ کے خلاف معرکہ آرائی کی۔ واقعہ نفس زکیہ جس میں سادات و علمائے حجاز نے مل کر عباسیہ کے خلاف پُرزور بغاوت کی، یہ اور اس کے سوا دوسرے واقعات نے جن میں اصلاح و انقلاب کے علمبرداروں کو کامیابی نہیں ہوئی، خونریزی اور فتنوں کا دروازہ کھول دیا۔ اس لئے پچھلے متکلمین اور فقہاء نے یہ اصول بنالیا کہ ہر اصلاح طلبی میں یہ دیکھنا چاہیئے کہ فتنوں کے نئے دروازے تو نہیں کھلتے، اور حالات بد سے بدتر تو نہیں ہو جائیں گے

ان اصلاح طلبوں اور انقلابیوں کی ناکامی کی بڑی وجہ یہ تھی۔ کہ انقلاب سے پہلے انہوں نے انقلاب کی دعوت کا دور اپنے اوپر نہیں گزارا، اور زمین میں ہل چلانے سے پہلے زمین میں تخم ریزی شروع کر دی، آخر اسی زمانہ میں ابو مسلم خراسانی کی تحریک جس سے عباسیہ حکومت کا آغاز ہوا، اور اسماعیلیوں کی تحریک جس سے دولت فاطمیہ پیدا ہوئی، اور محمد بن تومرت کی تحریک جس سے موحدین مراکش کی سلطنت قائم ہوئی، کس طرح دعوت کی راہ سے بڑھی اور پھلی اور پھولی اور مدتوں قائم رہی، زمانہ کے انقلابات نے آج بہت سے امکانات پیدا کر دئے ہیں، ہر جگہ شخصی سلطنتوں کے تخت خالی ہو گئے، دستوری اور جمہوری اور عوامی سلطنتوں کے آئین پر حکومتیں قائم ہو رہی ہیں، پھر کوئی وجہ نہیں کہ اسلامی اصول سلطنت قائم کیوں نہیں ہو سکتی، اس راہ کے جو موانع ہیں وہ حسب ذیل ہیں:-

۱۔ مسلمان ملکوں کا بڑا حصہ نامسلمانوں کے قبضہ میں ہے، اس لئے ان مسلط قوتوں سے ٹکرائے بغیر اس میں کامیابی نہیں ہو سکتی۔

۲۔ مسلمان ملکوں میں جو آزاد بھی ہیں وہ نامسلمانوں کی سیاست اور مادی و ذہنی برتری کے سامنے عاجز و درماندہ ہیں۔ یعنی ان کی ذہنی غلامی میں مبتلا ہیں، وہ انہی کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، اور انہی کے کانوں سے سنتے ہیں، وہ اُسی کو خیر سمجھتے ہیں جس کو یورپ خیر سمجھتا ہے۔ اور اسی کو شر جانتے ہیں جس کو یورپ شر کہتا ہے۔

۳۔ اور سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اسلامی سیاست و حکومت کے آئین و اصول و دستور سے خود مسلمان واقف نہیں، صدیوں کی ظلمت و جہالت نے اسلام کے نور پر پردے ڈال دئے ہیں۔ اور قیصری و کسرائی و خاقانی دستور و آئین اس طرح مخفی ہو گیا ہے، کہ آج ہم کو اس قیصریت و کسرائیت میں جس کو مٹانے کو اسلام آیا تھا، اور اسلام میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ اسلامی حکومت و سیاست کے مولفین میں بڑا نام قاضی ماوردی شافعی کا ہے، وہاں بھی اصل حقیقت مستور ہے، ایک دوسرے حنبلی عالم کی کتاب بھی چھپ گئی ہے، اس میں بھی حقیقت کا پتہ نہیں، ابن خلدون کے مقدمہ میں بہت کچھ ہے

مگر ماضی کی داستان سرائی نے حال و مستقبل پر پردہ ڈال دیا ہے۔

حق یہ ہے کہ اس باب میں ہندوستان کے مصلح اعظم شاہ ولی اللہ صاحبؒ کو اولیت کا شرف اصل ہے۔ ازالۃ الخفاء عن تاریخ الخلفاء صرف علم کلام اور مناظرہ کی کتاب نہیں ہے بلکہ اسلامی اصول سیاست خلافت پر بڑی دقیق اور محققانہ کتاب ہے۔ لیکن مطالب دوسرے مضامین کے ساتھ متفرق اور بکھرے ہوئے ہیں، مولانا اسمٰعیل شہیدؒ پہلے شخص ہیں جنہوں نے منصب امامت میں اسلامی اور غیر اسلامی اصول و آئین حکومت کو خالص کر کے دیکھا، اور مسلمانوں کی حکومتوں اور سلطنتوں کے مدارج اور مراتب مقرر کئے۔

اب جب مسلمانوں کی آنکھیں کھلی ہیں تو نظر آتا ہے، کہ یورپ کے پیدا کردہ اقلیت اور اکثریت کے مسئلہ نے ایسی اہمیت پیدا کر لی ہے، اور وہ دماغوں پر اس طرح مسلط ہے کہ ان ملکوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں، اپنے لئے کسی اصول و آئین کا قیام اُن کا سرتاسر محال نظر آتا ہے، اور جہاں وہ اکثریت میں ہیں، یورپ کے پیدا کردہ مسئلہ وطنیت نے اُن کو از خود فراموش بنا رکھا ہے، اور مسلمان کی زندگی ان دونوں باطل نظریوں اور عقیدوں کے نذر ہو رہی ہے۔ اور ہندوستان کی وہ اسلامی تحریک جوان دونوں سے خود دارانہ علیحدگی چاہ رہی ہے، وہ ابھی تک ایجابی کی بجائے سلبی قوت ہے۔ اور دائمی اور پائیدار زندگی ایجابی و تعمیری قوت کے اندر مضمر ہے۔ بہرحال توقعات قائم ہیں، اصلاح کی کوششیں جاری رہیں تو ممکن ہے کہ دوسروں کی نقالی کی بجائے خود اپنے اسلافِ اوّلین کے کارناموں پر نظر پڑے اور یونانی و رومانی قانون و طریق عدل کی جگہ کتاب و سنت اور قانونِ اسلام کی اتباع کا شوق پیدا ہو لیکن اس کے لئے اصلاحی جدوجہد اور اسلامی سیاسیات پر صالح لٹریچر لکھ کر پھیلانے کی ضرورت ہے

اس موقع پر ایک واشگاف بات کہنی ضرور ہے، بعض اہل قلم اس بات کی کوشش کر رہے ہیں۔ کہ موجودہ جمہوریت کے اصول و آئین کو ایک ایک کر کے لیں اور اس کا سراغ اسلام میں لگائیں اور اسلامی شریعت کی دلیلوں سے ثابت کریں۔

دوسری طرف یہ کوشش جاری ہے کہ خلافتِ راشدہ کے انتخابی و انتظامی طریقوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ نکالیں اور ان کو جامد اصول کی طرح تسلیم کر لیں، جیسا کہ ہمارے متکلمین اور فقہائے سیاست نے خلفاء اربعہؓ اور امیر معاویہؓ کے طریق انتخاب اور تسلط و استیلاء کو ہمیشہ کے لئے دائمی اصول قرار دے لیا ہے حالانکہ پیش آجانے والے واقعے کسی مذہب کے ایسے مقررہ اصول نہیں بن سکتے جن میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی جس طرح جہاد فرض ہے، اور اس کے آلات جو عہدِ خلافت میں رائج تھے، حملہ اور دفاع کے آلات اُن میں محدود نہیں، زمانہ کے حالات کے ساتھ ان میں ترقی اور تغیر ممکن ہے۔

انتخاب کے نئے آئین بن سکتے ہیں، قانون سازی اور اختلاف آراء کے موقع پر فیصلہ کے طریقوں میں نئی راہیں نکالی جاسکتی ہیں۔ اجماع اور قیاس کے اصولوں کے بہت سے نئے فیصلوں کی گنجائش ہے مگر ضرورت ہے کہ یہ سب کچھ کتاب وسنت، قضایائے خلفائے راشدین اور مسلمات فقہائے اسلام پر اسی طرح مبنی ہوں، جسطرح یورپ کے ہر قانون کی بنیاد رومن لا کے اصولوں پر ہے۔

ہم نے جہاں تک اسلام کے سیاسی اصولوں کا جو کتاب وسنت میں پھیلے ہیں مطالعہ کیا ہے یہ چیز نظر آتی ہے کہ چند بنیادی اصول ایسے ہیں جو اسلام میں اصول کی حیثیت رکھتے ہیں جن سے انحراف ہی نہیں، مثلاً یہ کہ :

۱۔ خلیفہ کے انتخاب میں کہ وہ بہتر سے بہتر ہو جتنی کاوش ممکن ہو کی جائے، پھر انتخاب کے بعد اس کے احکام کی جو کتاب وسنت اور مصالح مسلمین کے خلاف نہ ہوں اس کا حکم واجب الاتباع ہے۔

۲۔ امور مہمہ میں جو منصوص نہ ہوں اہل حل وعقد سے شوریٰ کیا جائے۔

۳۔ بیت المال خلیفہ کی ذاتی ملک نہیں، وہ صرف مصالح مسلمین کے لئے ہے، اس میں ہر ناجائز تصرف خیانت ہے، اور بیت المال اور اس کے اصول وقواعد اسلامی سیاست اقتصاد کے نہایت ہی اہم اصول ہیں۔

۴۔ سلطنت کے نظم ونسق میں حد درجہ سادگی اور کم خرچی اختیار کی جائے۔

۵۔ عہدہ دار اور اہل منصب میں ادائے فرض کے اندر پوری امانت برتی جائے، ان میں سے ہر فرد اپنے کو اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہ سمجھے۔

۶۔ عہدہ داران سلطنت کے لئے مقررہ وظیفہ کے علاوہ رعایا سے کسی کام کا تحفہ نذرانہ اور اخذ زر قطعاً ناجائز ہے۔

۷۔ رعایا سے شرعی ٹیکس کے علاوہ دوسرے قسم کے غیر شرعی ٹیکس نہیں لئے جاسکتے فقہ اس کی تفصیلات موجود ہیں۔

۸۔ حکام پر پورا پورا عدل وانصاف فرض ہے، عدل وانصاف کی راہ میں رشوت طرفداری بے انصافی، ظلم گناہ کبیرہ ہے۔

۹۔ کاشتکار اور زمیندار کے درمیان اتنا ہی تعلق ہے، جتنا ایک مزدور یا اجارہ دار اور مالک

کے درمیان ہے، اس کے تفصیلی احکام فقہ کی کتابوں میں ہیں۔

۱۰۔ اسلامی حکومت کے اندر ہر مسلمان جو معذور نہ ہو، اس کا سپاہی ہے۔

۱۱۔ غیر مسلم رعایا کی حفاظت جان و مال و مذہب کے مسلمان ذمہ دار ہیں، اور ان سے مصالحت کے وقت جو شرطیں قرار پاتی ہوں ان کو پورا کرنا حکومت پر واجب ہے۔

۱۲۔ قانون اور حدود میں ہر ادنیٰ و اعلیٰ برابر ہے۔

یہ چند سرسری واقعات ہیں، تلاش سے ان میں کچھ اور اضافہ ہو سکتا ہے، ان دفعات پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اسلامی اصول سیاست ظاہری ہیئت و شکل پر زیادہ زور نہیں دیتا۔ بلکہ اس کا اصلی زور روح اور اسپرٹ پر ہے، اس اصلی روح اور اسپرٹ کی بحالی کے ساتھ اگر غیر قوموں سے نظم و نسق کے کچھ قواعد لئے جائیں، تو کچھ حرج نہیں، جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ خندق میں کھائی کھود کر حصار بنا لینے کا طریقہ اہل فارس سے حاصل کیا، آلات جنگ میں منجنیق کا استعمال اہل یمن سے عہد نبوی ہی میں مسلمانوں نے سیکھا، حضرت عمرؓ کے زمانہ میں حکومت کے دفاتر کا طریق ایرانیوں اور رومیوں سے اخذ کیا، زمین کی پیمائش اور بندوبست ایرانی زمینداروں کے ذریعہ سے رائج کیا گیا، ان مثالوں سے ظاہر ہے کہ نظم و نسق حکومت کے دو طریقے جو اسلامی روح سیاست کے منافی نہ ہوں وہ غیر قوموں سے حاصل اور نقل کئے جا سکتے ہیں، اور آج یورپ کے ان انتظامی اصولوں اور طریقوں کو جو اسلامی اصول کے خلاف نہ ہوں، قبول کیا جا سکتا ہے، ضرورت ہے کہ ہمارے نوجوان علماء جن کی طبیعتوں میں امنگ ہے وہ ان مسائل پر تحقیقی مضامین لکھیں اور مسلمانوں کی نئی سیاسی زندگی کیلئے نئی راہیں کھول لیں۔ ■■

اسلامی نظام کے تحت معاشی اصلاحات کیا ہوں گی۔؟ اور ان سے غریبوں کو کیا فائدہ پہنچے گا۔؟ ——— مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے

ماہنامہ **البلاغ** کراچی

کے تازہ شمارے دسمبر میں ان سوالات کا مفصل جواب دیا ہے، پچاس سے زائد عملی تجاویز جو معاشرے کی کایا پلٹ سکتی ہیں!

قیمت فی پرچہ ۷۵/- سالانہ آٹھ روپے، غیر ممالک سے ایک پونڈ بذریعہ ہوائی ڈاک دو پونڈ، مشرقی پاکستان ۹/۵ روپے

——— البلاغ دار العلوم کراچی ۱۴

علوم و معارف

ملفوظات

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رح

مہاجر مکی

بروایت حضرۃ حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رح

★

فرمایا: ارشاد باری ہے: یَخَافُوْنَ یَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِیْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ۔ اس دن سے ڈرتے ہیں جس میں دل اور آنکھیں الٹ پلٹ ہو جائیں گی۔ اس میں عُجب کا علاج ہے یعنی انکو عبادت کر کے ناز نہیں ہوتا، دوسری جگہ ارشاد ہے: قُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ مطلب یہ کہ ان میں باوجود عبادت کے پھر خوف ہے، عُجب نہیں۔ ایک مسئلہ یہاں اور مستنبط ہوتا ہے وہ یہ کہ جو عمل کو، ہیچ سمجھے گا، ثمرات کا منتظر نہ ہوگا تو اس میں اسکی بھی تعلیم ہے کہ اعمال کے ثمرات کا انتظار نہ کرو، جیسے آجکل اکثر کی یہ حالت ہے کہ دو چار روز ذکر کیا اور منتظر ہوئے تجلی کے، حضرت حاجی صاحب رح ان تجلیات کے متعلق فرماتے تھے کہ حجاب نورانی اشد ہیں حجاب ظلمانی سے[1]، کیونکہ سالکین کو جو انوار نظر آتے ہیں وہ ظاہر ہے خدا تو نہیں غیر خدا ہیں۔ مگر یہ عجیب ہونے کے سبب اُنکی طرف توجہ کرتا ہے ان سے مزے لیتا ہے، حتیٰ کہ بعض اوقات اُنکو مقصود سمجھنے لگتا ہے بخلاف حجاب ظلمانی کے کہ اُنکی طرف ایسا التفات نہیں ہوتا اس لئے وہ اشد ہیں، مگر لوگ ان ثمرات مانعہ کو ہی چاہتے ہیں اور انہی کو مقصود سمجھتے ہیں، سو ان کے آنے کا ہرگز قصد نہ کرے اور اگر بلا قصد آئیں[2] تو اُنکی طرف التفات

---

[1] لطائف بھی حجب ہیں، حجب نورانیہ حجب ظلمانیہ سے اشد ہیں۔ دنیا میں حق تعالیٰ کی رویت کا ادراک نہیں ہوتا نہ نظر سے نہ قلب سے۔ ہاں لطیفہ قلب کیطرف توجہ رکھنا چاہئے کیونکہ حدیث میں قلب کا ذکر ہے اور اسکی طرف توجہ کا اثر یہ ہے: مَنْ صَلّٰی رَکْعَتَیْنِ مُقْبِلًا عَلَیْهِمَا۔ یعنی جس شخص نے حضور قلب سے دو رکعت نماز پڑھی سبحان اللہ حدیث کا کتنا ادب ہے کیا آج کوئی شیخ نقشبندی بھی ایسا ہے۔ غرض سالک کو حضرت عارف کے قول پر عمل کرنا چاہیئے

[2] حدیث مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو ۔ کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمہ را

(استمداد التوبہ صـ۱۱)